صدیق سالک کا ''پریشر ککُر'' معاشرتی تناظر کے آئینے میں

ڈاکٹر روبینہ یاسمین

Dr. Rubina Yasmeen,

Govt. Post Graduate College For Women, Sargodha.

Abstract:

Siddiq Salik was born on September 6 at Distt. Kharian, Punjab. His father was an average farmer having some agricultural land. He was just a toddler when his father passed away leaving a young widow with four kids to face the hardships of the world. The inherited land was usurped by his paternal uncle. Despite unfavourable circumstances his mother Aalim Bibi played her role heroically and educate him along with his three sisters utilizing her limited resources. According to rural tradition he completed recitation of the Holy Quran first and then got admission in the School. After passing 9th grade he left school and appeared as a private candidate for Matriculation exams. He bagged 1st position among all the private candidates. From Zamindar college, Gujrat he did F. A and did graduation from Islamia College, Lahore. From the same institution he got Masters degree in English literature. In 1963 he got diploma in International Relations from Punjab University, Lahore and joined Journalism. On December 17,1964 he got commission in Pak Army as a public Relations officer. During 1971 war he was imprisoned and declared POW. During imprisonment he wrote his memoir'Witness to Surrender'. Meanwhile his mother died in 1973 while he was still in India as a prisoner. When Martial law by Gen Zia was imposed on July 6,1977 he served as Press Secretary to President and wrote many speeches for him. In 1984 he was promoted as a Colonel and later on

promoted to the rank of Brigadier in 1985.He was serving as Director General ISPR when killed in an air crash along with General Zia on August 17,1988. The title of his novel 'Pressure Cooker ' is symbolic. However, the said novel does not fall in the category of symbolic novel as there is no abstractionism in it.

The article under review is an attempt to analyse Siddiq Salik's novel "Pressure Cooker" in the backdrop of current social perspective. It highlights not only a particular era when it was written but also mirrors the prevailing social set up of Pakistan under moral deterioration and crumbling values depict the decline of humanity. These exploiting others for personal benefit, is the foremost requisite and survival of the fittest is the only option. Innovation and logical thinking is discouraged in the grab of conservatism religious extremism.

صدیق سالک نے ناول کا نام ''پریشر ککر'' رکھا۔ یہ نام علامتی ہے مگر ناول کو علامتی ناول نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس میں تجریدیت نہیں ہے۔ انھوں نے پیش لفظ دیباچہ یا تعارف کی روایت سے ہٹ کر ناول شروع کیا اور ایک نئی طرح ڈالی۔ صدیق سالک فوج میں ملازم تھے اور صدرِ پاکستان کی تقاریر لکھنے پر مقرر تھے۔ اس عہدے کے باوجود اُنھوں نے حکومت کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو بیان کیا۔ کردار نگاری پر بہت توجہ دی اور بڑی مہارت سے کردار تخلیق کیے۔ اُن کے کردار معاشرے کے جیتے جاگتے اور ہمارے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

عشق و عاشقی سے ہٹ کر رومانیت سے پرے آج کے پاکستانی معاشرہ اور اس کے زوال کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ ناول کا انتساب اُنھوں نے معاشرتی دکھ اور کرب کو محسوس کرتے ہوئے ''اپنے اپنے پریشر ککر میں گلنے والے ہر انسان کے نام'' کیا ہے۔ اُن کا تجربہ وسیع اور احساس کی سطح بلند ہے۔ سوچ آفاقی اور انسانیت کے لیے درد کی ٹھیس سینے کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ اس دور کے انسان کا بڑا المیہ اُس کی تنہائی کا کرب ہے۔ کوئی دوسرا اُسے جاننا یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا، سننا ہی نہیں چاہتا تو وہ اپنا دکھ کس سے کہے۔ اُن کا کہنا ہے:

> ''کیا انسان واقعی ہی دوسرے انسان کو مکمل طور پر جان سکتا ہے؟ یا ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہتے ہیں۔ کسی درخت کے پتے دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ یہ درخت مضبوط ہے کہاں تک درست ہے؟ کیا سبز پتوں والے درخت کا تنا کھوکھلا نہیں ہوسکتا؟''(۱)

جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں وہ ہمارے لیے واقعی پریشر ککر ہے جس کی گرمی اور حدت سے افراد پگھل رہے ہیں اور اس تپش سے نجات کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ جھوٹ اور فریب کا بازار گرم ہے۔ ہوس پرستی، اغوا اور بدکاری عام ہے۔

منافقت راج کرتی ہے اور شرافت دم توڑ رہی ہے۔ اقدار بدل گئی ہیں۔ معاشرہ زوال پذیر ہے جس میں کام کرنے والوں کو دبایا جاتا ہے۔ اُنھیں بدنام کر کے کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا ہے اور اُنھیں اذیت دے کر اپنے راستے پر لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اسی معاشرے اور اس کی زندگی کے ہر شعبہ کی برائیوں کو کرداروں کے ذریعے نمایاں کیا ہے۔ نیکی کا مارا مولوی جو ریشماں سے عقدِ ثانی کرنے کو تیار تھا تو کہیں اُس کا جیٹھ شرفو جو اپنے بھائی کے بچوں کے منہ سے نوالہ چھین لینا چاہتا تھا اور بھابھی سے نکاح کرنے کا خواہش مند تھا۔ ناول فلیش بیک (Flashback) کی تکنیک سے لکھا گیا ہے۔

پہلے حصے میں مصنف اور اُس کا دوست فطرت کی گمشدگی کا پتہ کرنے اسلام آباد جاتے ہیں۔ دوسرے حصے میں فطرت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ فطرت کی پیدائش سے لے کر آخر تک کے حالات ہیں۔ تیسرے حصے میں فطرت کی بیوی سے اُس کے گھر سے بھاگ جانے کا پوچھتے ہیں۔

یہ ایک کرداری ناول ہے۔ مرکزی کردار فطرت ہے اُس کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ فطرت ایک مصوّر ہے جو تصویریں بناتے بناتے خود تصویر بن جاتا ہے۔ فطرت نام بھی علامتی ہے یعنی فطری آدمی جو فطرت سے قریب اور معاشرتی منافقت سے دور ہے۔

فطرت فیصل آباد کے گاؤں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے والد کرم دین کی زمین سیم اور تھور کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ واپڈا میں ملازمت کر لیتا ہے۔ ایک دن فطرت کا باپ ایک لڑکی کو ڈاکوؤں کے چُنگل سے بچانے کے لیے ڈاکوؤں سے گتھم گتھا ہو جاتا ہے۔ لڑکی کی عزت تو بچ جاتی ہے مگر کرم دین کی جان نہیں بچتی۔ اُس کی بیوی ریشماں کی بہت پذیرائی کی جاتی ہے۔ حکومت اُسے دو ہزار روپے (جو اُس وقت بڑی رقم تھی) اور اعزاز بھی دیتی ہے جس سے وہ خوشحال ہو جاتی ہے مگر گاؤں میں اپنے رشتہ دار ہی اُس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اُس کا جیٹھ شرف دین اُس کی زمین پر قبضہ کر لیتا ہے۔ ریشماں شہر میں ایک نیک آدمی کے گھر نوکری کر لیتی ہے۔ وہاں فطرت کی بہن ذکیہ کو دن دہاڑے ڈاکو اُٹھا لے جاتے ہیں مگر بے حسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی آگے بڑھ کر روکنے والا نہیں ہے۔ فطرت حساس طبیعت کا مالک ہے۔ مایوسی کے ساتھ ساتھ فطرت تعلیم بھی جاری رکھتا ہے۔ M.A فائن آرٹس میں داخلہ لے لیتا ہے۔ ماسٹر کے بعد اُس کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی میں اُستاد بنے اور اس معاشرے کے لوگوں میں انسانیت سے محبت کو اُجاگر کرے مگر اس کے ان خیالات کی وجہ سے اُسے کمیونسٹ قرار دیا جاتا ہے اور یونیورسٹی میں اس طرح کے آزاد خیال لوگوں کی جگہ نہیں اور اُسے نوکری نہیں ملتی۔ کیوں کہ صدر شعبہ مسز شیخ اُسے نوکری نہیں دینا چاہتی کہ اُس کی اپنی نوکری خطرے میں نہ پڑ جائے۔ ہمارے یہاں کوئی نہ کوئی نعرہ مطلب پرست لوگوں کی روٹی کے لیے چلتا رہا۔ اسلام کو کبھی سوشلزم سے تو کبھی کمیونزم سے خطرہ رہا۔

یہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کا ناول ہے جب امریکہ ہر طرف کمیونزم کے خلاف زمین ہموار کر رہا تھا اور پاکستان میں مذہبی عناصر کو کمیونزم کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ فطرت اس نعرے کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے:

> ''کیا سماجی انصاف کی بات کرنا کمیونزم ہے یا عین اسلام؟ کیا معاشرے میں غربت، افلاس، جبر و تشدد اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا اشتراکیت ہے یا سماجی جہاد؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق محض اس لیے سلب کر

لے کہ وہ طاقت ور ہے، دولت مند ہے، با اثر ہے۔۔۔۔میرے خیال میں ہمیں یہ احتیاط کرنی چاہیے کہ ہم سماجی بھلائی کی ہر کوشش کو کمیونزم یا اشتراکیت کے کھاتے میں نہ ڈالیں کیوں کہ اسلام خود سماجی انصاف کا دین ہے۔اس سے بڑھ کر انسانی بہبود کا کوئی اور نظریہ سامنے نہیں آیا۔''(۲)

وہ مزید تعلیم کے لیے امریکہ جاتا ہے مگر اپنے ملک میں واپس آنے پر بھی اُسے نوکری نہیں ملتی کیوں کہ اب اُس پر CIA کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگتا ہے۔صدیق سالک نے مس نزہت کی زبانی اپنے فلسفۂ حیات کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

''مجھے معلوم ہے کہ تم نان کنفرمسٹ ہو۔عموماً Non-confirmist لوگ زندگی میں compromise نہیں کرتے۔تم بھی نہیں کرو گے۔ ہر نوعمر تخلیق کار کی طرح تم چاہو گے کہ تخلیق کی دنیا میں زندہ رہو، اپنی تخلیق کے حوالے سے پہچانے جاؤ اور ممکن ہو تو اپنی تخلیق کے سہارے زندہ بھی رہو،لیکن میں تمہیں زندگی کی تلخ حقیقت بتاتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ جتنی جلدی ہتھیار ڈال دو گے جتنی جلدی اندر کی آگ بجھا لو گے جتنی جلدی مصالحت اور مصلحت کی راہ پر آ جاؤ گے اُتنے ہی سکھی رہو گے۔ پٹے ہوئے راستوں پر چلنا آسان ہے اور نئے راستے بنانا دشوار ہے۔''(۳)

''طرزِ کہن پر اڑے ہوئے اس معاشرے میں نئی سوچ جرم ہے۔پروفیسر عابد حیات فطرت کو مشورہ دیتے ہیں کہ:

''سوچنا چھوڑ دو۔فطرت کے انکار پر کہتے ہیں کہ اگر یہ نہیں کر سکتے تو سوچو ضرور مگر اس کا اظہار کرنا بند کر دو۔اپنے خیالات کو اپنے تک محدود رکھو، اپنی سوچ کو اپنے ذہن کی فصیل میں مقفل کر دو۔''(۴)

فطرت اس سخت پابندی پر احتجاج کرتے ہوئے کہتا ہے:

''یعنی اپنے ذہنی پریشر ککر کا ڈھکنا خود کس دوں؟

''ہاں''

''اور اس کے نیچے سوچ کی آنچ جلتی رہنے دوں''

''ہاں''

''اور اسی پریشر ککر کی آنچ میں جلتا رہوں،گلتا رہوں،سڑتا رہوں''

''ہاں۔ہمارے معاشرے میں تخلیق کار کا یہی مقدر ہے۔''(۵)

فطرت ان الزامات اور طعنوں کی تپش سے ککر کی طرح اندر ہی اندر کھولتا ہے اور ایک دن دیوانگی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔وہ مصالحت کا رستہ اختیار نہیں کرتا۔دیوانگی اختیار کر لیتا ہے اور اُس کی دیوانگی اس بات کی دلیل ہے کہ اُسے اپنے مشن کی صداقت کا یقین تھا۔وہ کسی طبقے کی بجائے ایک رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔

فطرت کی فطرت کو کہیں چین نہیں آتا، حالات کی کشمکش کی چکی میں وہ مسلسل پستا ہے۔حالات سے مجبور ہو کر وہ ایک

پرائیوٹ فرم میں جاب کرتا ہے مگر یہاں بھی اُسے اپنی خواہش اور مزاج کے مطابق تصویریں نہیں بنانے دی جاتیں۔ وہ اُسے جبر اور غربت کی تصاویر نہیں بنانے دیتے، معاشرے کی عکاسی کرنے نہیں دیتے۔ آخر میں وہ ملازمت کو ترک کر دیتا ہے تو پروفیسر سعید اُسے جو مشورہ دیتے ہیں وہ معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اُسے مشورہ دیتے ہیں:

''مجھے دیکھو جب سے Compromise (سمجھوتہ) کیا ہے بڑے سکون میں ہوں۔ بال بچوں کے ساتھ کوٹھی میں رہتا ہوں، صبح نوکری کرتا ہوں شام کو آرام کرتا ہوں۔ میری مانو تو اندر کے کیڑے کو مسل ڈالو اُسے دفن کر دو جب تک اندر بتی جلتی رہے گی کھلبلی مچی رہے گی۔ آرام اور سکون چاہتے ہو تو اس بتی کو گل کر دو ورنہ ساری عمر سردار لٹکے رہو گے۔''(۶)

اب وہ پروفیسر سعید کے مشورے سے ''ادارۂ شناخت پاکستان'' میں نوکری کر لیتا ہے۔ ادارۂ شناخت پاکستان میں وہ دفتر کی ولایتی فٹنگز اور پرائیوٹ کوٹھی میں پاکستان کی شناخت کے ادارہ کا دفتر کا دکھا کر کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ وہاں سیکرٹری صاحب کی ناراضی، ڈی جی کی سرزنش، غیر سرکاری اور اضافی کاموں کے لیے ہر طرف سے جھاڑیں ملتی ہیں۔ پی اے سیکشن کے انچارج شمسی صاحب سے فطرت یوں گویا ہوتا ہے:

''میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں ایک ایسی چمنی میں بدل گیا ہوں جو نہ آٹا پیسنے والی چکی کی طرح پھک پھک کر سکتی ہے نہ بھٹے کی چمنی کی طرح دھواں باہر پھینک سکتی ہے بس ہر شے اندر ہی اندر، ہر غم اندر، ہر اندوہ اندر سہتے رہو، سلگتے رہو، مگر بولو مت کہو مت۔''(۷)

شمسی کا جواب کہ یہ صرف تمہارا مسئلہ تو نہیں ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اپنے اپنے حالات میں اپنی اپنی جگہ ہر شخص تنگ ہے پریشان ہے اُداس ہے۔ ہمارے معاشرے کے افراد کی ذہنی عکاسی کرتا ہے۔

وہ تصویریں بناتا ہے اور اُن کی نمائش کرتا ہے۔ نمائش کے بعد اخباری تبصروں کی روشنی میں اُسے کمیونسٹ اور CIA کا ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے۔ اُسے دھمکیاں ملتی ہیں، آخر وہ گھر سے بھاگ نکلتا ہے۔ اپنی تصویریں اور برش لے کر کیوں کہ پریشر ککر اب اس سے زیادہ پریشر برداشت نہیں کر سکتا اور پھٹ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''جیت گیا، جیت گیا، نکل گیا، نکل گیا، لے لیا بدلہ میں نے لے لیا، پاگل ہیں سارے بیوقوف، کیا کر لیں گے میرا، کیا بگاڑ لیں گے، پاگل بیوقوف کہیں کے، نکل گیا، میں نکل گیا۔۔''(۸)

یوں عالمِ دیوانگی میں وہ اپنے پریشر ککر سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا اور اپنے اہل وعیال کو ایک نئے پریشر ککر میں ڈال گیا۔

''عبدالفطرت'' پریشر ککر کا مرکزی کردار ہے جس کے گرد ناول کی ساری کہانی گھومتی ہے۔ فطرت کا کردار ایک ارتقائی کردار ہے۔ اس میں ہمیں یونانی کلاسیکل ڈرامے کی ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔

صدیق سالک نے اس ناول میں اپنے ذاتی دکھ درد کو آفاقی رنگ دیا ہے۔ اُن کے اپنے حالات بھی اس ناول کے مرکزی کردار سے مشابہ ہیں۔

دوسرے کردار بھی ہمارے معاشرے کے کردار اور خیر اور شر کے نمائندے ہیں۔ چوہدری سکندر عیار انسان ہے جو ریشماں کی دولت ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب شیخ اور اُس کی بیوی سائرہ شیخ نیکی کے نمائندہ ہیں۔ پروفیسر سعید کا کردار اور حقیقی اُستاد کا کردار ہے جو گہری سوچ رکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے فطرت میں بھی سوچ، فکر اور معاشرتی برائیوں سے نفرت کا مادہ اُجاگر کرتے ہیں۔

نسوانی کرداروں میں ریشماں بہت اہم اور مضبوط کردار ہے جو باپ کے نہ ہونے پر بھی اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہے۔ قربانی کا جذبہ اور ممتا دونوں اُس میں بدرجہ اتم موجود ہیں جبکہ مسز نادرہ شیخ شعبہ فائن آرٹ کی صدر شعبہ ہے اور خودغرض ہے۔ وہ دوسروں کو آگے بڑھتا دیکھنا نہیں چاہتی۔ جب کہ زبیدہ فطرت کی بیوی اور دیہاتی ہے مگر اسلام آباد میں رہائش سے اُس کا دیہاتی پن ختم ہو جاتا ہے اور وہ وہاں کی چکا چوند دیکھ کر خود بھی راتوں رات امیر ہونے کا خواب دیکھنے لگتی ہے۔ زبیدہ کے طعنوں سے تنگ آ کر فطرت گاؤں کی چھوٹی موٹی ہی سہی جائیداد فروخت کر کے آتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی جڑیں کاٹ کر فروخت کر دیں۔ اب اُس کے پاؤں اپنی دھرتی پر نہیں رہے'' پہلے وہ پابہ گل تناور درخت تھا، اب پرکاہ بن گیا ہے ''(ص ۲۸۵)۔

اس ناول نے ہمارے عہد کی گھٹن، مارشل لاء سے پیدا ہونے والے خوف، جبر و تشدد کی فضا کے ساتھ ساتھ ہماری معاشی اور معاشرتی ناانصافیوں کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ کسی پر CIA کا ایجنٹ ہونے یا کمیونسٹ ہونے کا الزام ہی کافی ہے اُس کے لیے کسی ثبوت یا دستاویز کی ضرورت نہیں۔ پھر مارشل لاء میں کسی شخص کو اتنی آزادی دی ہی نہیں جاتی کہ وہ نئی سوچ یا حکومت کے خلاف کوئی آواز اُٹھا سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حساس انسان اپنی ہی ذات کے پریشر ککر میں اپنی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ دم توڑ دیتے ہیں مگر کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ کتنے نئے خیالات ایک شخص کے ساتھ دفن ہو گئے۔ اسی طرز کُہن کے خلاف جرأت مندانہ آواز صدیق سالک نے اس ناول میں اٹھائی ہے۔

یوں اس ناول کو ہمارے مارشل لاء عہد اور اُس کے جبر و ستم اور معاشرتی ناانصافیوں کی دستاویز بھی کہا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صدیق سالک، پریشر ککر، لاہور: الفیصل ناشران، س ن، ص:۹

۲۔ ایضاً، ص:۳۱۳

۳۔ ایضاً، ص:۱۸۷

۴۔ ایضاً، ص:۱۹۸

۵۔ ایضاً، ص:۹۹۔۱۹۸

۶۔ ایضاً، ص:۶۲۔۲۶۱

۷۔ ایضاً، ص:۳۰۰

۸۔ ایضاً، ص:۳۴۹

☆.....☆.....☆